میرؔ کی نظمیہ شاعری اور انسان دوستی

ڈاکٹر نصرت جبین

Dr. Nusrat Jabeen

Head of Urdu Department/Section Head of College,
Fauji Foundation College for Girls, Rawalpindi.

Abstract:

Mir Taqi Mir was a renowned poet of the 18th Century of Mughal Era. He was one of the pioneer who transformed and gave a comprehensive shape to the Urdu Language itself. He earned fame as the Urdu Ghazal Poet at Dehli School. His Complete works (Kulliaat), Consists of Six Diwans containing 13,585 Couplets comprising a variety of poetic forms ghazal, masnavi, qasida, rubai, mustezaad, Satire etc. He has emerged as a great poet who touched his pen on tyranny brutality and cruelty. He discussed regarding humanity, equality, liberty, freedom and sympathy in his poetry.

کارخانہءقدرت، تمام مذاہب عالم اور فکر وفلسفہ کی سب تحریکیں اس بات پر متفق ہیں کہ انسان کائنات کا مرکز ومحور ہے اور اشرف المخلوقات کی سند کے ساتھ دنیائے ہست وبود میں گرم سفر ہے۔ انسان ہی وہ ہستی ہے جس سے جہانِ رنگ وبو کے سارے ہنگامے موقوف ہیں۔ دنیا بھر کے مفکروں، دانشوروں اور فلسفیوں کی تحریریں عظمت انسانیت، بشریت پسندی، حقوق انسانی اور انسان دوستی کی غماز ہیں۔ انسان دوستی لاطینی زبان کے لفظ Humanitas سے ماخوذ ہے۔ یہ فلسفہ تکریم انسانیت، بشریت پسندی، فلاح بشر اور اعلیٰ اقدار کا متقاضی ہے۔ اس لئے آج بھی زندہ وجاوید ہے۔ تاریخ انسانی کا مطالعہ اس بات کا عکاس ہے کہ انسان دوستی نے ہر عہد میں اپنی اہمیت وافادیت کا لوہا منوایا ہے۔ ادب وفن میں اس اصطلاح کو یورپی احیائے علوم کی تحریک کے آغاز کے ساتھ استعمال کیا گیا۔ یہ نظریہ ایک تحریک کی صورت میں بھی اسی عہد میں نمایاں ہوا۔ بعد ازاں یہ اصطلاح مذہبی اور سیاسی تعلیمات اور تحریکوں میں بھی مستعمل ہوئی۔ ادب بنیادی طور پر بشریت پسندی، انسان پسندی اور انسان دوستی جیسی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے اور انھی افکار ونظریات کی ترویج وترقی کے لئے کمر بستہ رہتا ہے۔ جب کہ شاعر وادیب انسان دوست افکار ونظریات کا شعور انسانی معاشرے کی اقدار وروایات، اخلاقیات ونظریات اور اصول ومباحث سے حاصل کرتے ہیں اور انھیں اپنی تخلیقات میں سمو کر ایک مثالی معاشرتی زندگی کا خواب دیکھتے ہیں۔ یوں انسان دوستی ایک ایسی وسیع المعانی اصطلاح کے طور پر سامنے آتی ہے جس سے فکری سطح پر ادب کی تمام اصناف متاثر ہوتی ہیں۔ عالمی ادب میں انسان دوستی کے اثرات کا سراغ پانچویں صدی قبل مسیح تک لگایا گیا ہے جس کا براہ راست اظہار یونانی مفکر پروتاغورس کے اس قول سے ہوتا ہے۔

''انسان کائنات کی تمام اشیاء کا پیمانہ ہے اس بات کا پیمانہ کہ جو اشیاء ہیں وہ اس لئے ہیں کہ وہ ہیں اور جو اشیاء نہیں ہیں وہ اس لئے نہیں ہیں کہ وہ نہیں ہے۔''(۱)

انسان دوستی کا فلسفہ انسان کو کائنات کا مرکز و محور گردانتا ہے۔ یہ فلسفہ بنیادی طور پر انسانی زندگی کا مطالعہ اور اس کی ترقی کی کوشش کرتا ہے۔ اس فلسفے نے ایک طرف مروجہ دقیانوسی توہمات سے اپنا دامن چھڑایا اور دوسری طرف علمی اور روحانی فیض حاصل کر کے قدیم یونانی اور رومی ادبیات سے اپنا رشتہ قائم کیا۔ درحقیقت یہ نظریہ انسانی فطرت میں موجود چھپی صلاحیتوں کو سامنے لانے اور انسان کی موجودہ زندگی کو اعلیٰ بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ انسان دوستی کا نظریہ امن کا پیامبر ہے۔ ایسا امن جس میں انسانیت کو فروغ ملے۔ تنگ نظری اور متعصبانہ رویوں کی حوصلہ شکنی ہو اور رواداری کو فروغ دیا جائے۔ معاشرہ عدل و انصاف، مساوات، بھائی چارے، محبت، بردباری اور تحمل کا محور ہو۔ ظلمت کدوں میں ضیائے نور کی بارش ہو۔ مجبور، لاچار اور زیر دست افراد طاقتور اور توانا ہوں۔ ظالم اور مفسدوں کے ہاتھ بندھے ہوئے ہوں۔ قوم کے افراد میں ہم آہنگی بدرجۂ اتم موجود ہو۔ اسی صورت میں انسانیت کی بقا اور ترقی ممکن ہے۔ انسان دوستی کا فلسفہ انفرادی آزادی کا قائل ہے۔ آزادی کی قدر افزائی کو انسان دوست مفکرین نے اپنی اولین ترجیح ٹھہرایا۔ ان کو ایسی آزادی سے لگاؤ ہے جس کو انسان معاشرے کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لئے بروئے کار لا سکے۔ کیوں کہ آزادی انسان کا بنیادی اور پیدائشی حق ہے۔ جو اس میں یہ احساس بیدار کرتی ہے کہ اس کی ذات تمام کائنات پر محیط ہے اور وہ اس کائنات میں مانند بحر بیکراں اپنی دنیا آپ پیدا کرنے، اسے بنانے، سنوارنے اور ترقی دینے کے لیے کوشاں ہے۔ انسان دوستی کا فلسفہ دراصل قبائلی، نسلی، خاندانی اور اجتماعی تعصّبات اور فرقہ واریت کے امتیازات کے بتوں کو پاش پاش کر کے محبت کا پیغام عام کرنے اور انسانی اخوت اور عالمی برادری کے احساس کو پروان چڑھانے کا بلاوا ہے۔ یوں انسان دوستی کا تصور آزادی اور مساوات کو کسی ایک خطے، علاقے، ملک یا معاشرے تک محدود نہیں کرتا بلکہ رنگ و نسل اور زباں اور علاقائیت کی تقسیم کو ترک کر کے ایک مثالی معاشرے کے قیام پر زور دیتا ہے جہاں ہر انسان کو عدل و انصاف کے سائے میں اپنی صلاحیتوں کے پنپنے کا موقع مل سکے۔

اس تناظر میں خدائے سخن میر تقی میر کی نظمیہ شاعری کا جائزہ اس حقیقت کو عیاں کرتا ہے کہ ان کے ہاں ابتداء ہی سے ایک ایسا آدرش نمو پا چکا تھا جس کی اساس انسان دوستی کے فلسفہ پر استوار ہوئی ہے۔ ہر چند میر نے نادر شاہ کا قتل عام اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ابدالی کی تلواریں ان کے سامنے چمکیں، جاٹوں، سکھوں اور روہیلوں کے مظالم ان کی آنکھوں کے سامنے ہوئے۔ دلی کی تباہی، معاشرے کی بربادی، زمانے کی سفاکی اور انسان کی بے رحمی کے ایسے ایسے مناظر ان کی آنکھوں کے سامنے آئے جنہوں نے ان کو ہلا کر رکھ دیا۔ مولوی عبدالحق اس وقت کی دہلی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس وقت کی دلی تاریخ میں خاص حیثیت رکھتی ہے۔ وہ ہندوستان کی جان اور سلطنت مغلیہ کی راجدھانی تھی۔ مگر ہر طرف سے آفات کا نشانہ تھی۔ اس کی حالت اس عورت کی سی تھی، جو بیوہ تو نہیں مگر بیواؤں سے کہیں زیادہ دکھیاری ہے اور اولوالعزم تیمور اور بابر کی اولاد ان کے مشہور آفاق تخت پر بے جان تصویر کی طرح دھری تھی۔ اقبال جواب دے چکا تھا اور ادبار انحطاط کے سامان ہو چکے تھے اور سیاہ روزگار دو پیش منڈلا رہا تھا۔ نادر شاہ دست نگر اور امیر امرا مضمحل و پریشان تھے۔ سب سے اول نادر شاہ کا حملہ ہوا۔ حملہ کیا تھا۔ خدا کا قہر تھا۔

نادر کی بے پناہ تلواریں اور اس کے سپاہیوں کی ہوسناک غارت گری نے دلی کو نوچ کھسوٹ کر ویران و برباد کر دیا۔ ابھی یہ کچھ سنبھلنے ہی پائی تھی کہ چند سال بعد احمد شاہ درانی کی چڑھائی ہوئی پھر مرہٹوں، جاٹوں اور روہیلوں نے وہ اودھم مچائی کہ رہی سہی بات بھی جاتی رہی غرض ہر طرف خود غرضی، خانہ جنگی، طوائف الملوکی اور ابتری کا منظر تھا۔ یہ حالات میرؔ صاحب نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور دیکھے ہی نہیں ان کے جبر بھی سہے اور ان انقلابات کی بدولت ناکام شاعر کی قسمت کی طرح ٹھوکریں کھاتے پھرے۔'' (۲)

باپ کا مرنا میرؔ پر آسمان ٹوٹ پڑنا تھا۔ بڑے بھائی نے بھی پہلو تہی کی۔ میرؔ کو پہلی مرتبہ فکر معاش اور دنیا داری کی مصیبتوں سے سابقہ پڑا۔ تمام معاشرہ غم والم کی تصویر بنا ہوا تھا۔ جہاں ہر طرف بھوک، افلاس، ڈر اور خوف نے اپنے ڈھیرے جمائے ہوئے تھے۔ بقول جمیل جالبی ''ایک طرف زندگی کی بنیادی ضرورتیں تھیں جن کو پورا کرنا میرؔ کیلئے دشوار تھا اور دوسری طرف صدیوں پرانا معاشی، سماجی، سیاسی، تہذیبی نظام ان کی نظروں کے سامنے جاں کنی میں تھا'' (۳)۔ لیکن میرؔ اپنی شکستوں اور محرومیوں کے باوجود اپنے عہد کے عام انسان کے درد والم کا ترجمان بنا اور ان کے درد کا درماں کیا۔ میرؔ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی اس کی کشمکش نے انسان کو بلندی سے پستی کی انتہا تک پہنچا دیا تھا۔ خود غرضی، لالچ کی گرم بازاری نے معاشرے میں انسان ہمدردی کے جذبے کو مفقود کر دیا تھا۔ ایسی صورتِ حال میں انسان دوست میرؔ نے معاشرے میں محبت ہمدردی، ایثار، قربانی اور وفاداری کے جذبے کو پروان چڑھایا اور اپنی رباعیات کے ذریعے آدمیت کا پیغام عام کیا۔

ملیے اس شخص سے جو آدم ہووے
ناز اس کو کمال پر بہت کم ہووے
ہو گرم سخن تو گرد آوے یک خلق
خاموش رہے تو ایک عالم ہووے (۴)

بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:

''میرؔ انسان کو عظیم سمجھتے ہیں لیکن اُن کے خیال میں اس کی عظمت اس طرح قائم رہ سکتی ہے کہ وہ بعض اصولوں کو پیش نظر رکھے۔ اس کے پاس زندگی بسر کرنے کے چند معیار ہوں اور وہ اصول و معیار یہ ہیں کہ انسان کو اس زندگی میں محبت، خلوص اور صداقت سے رشتہ جوڑنا چاہیے۔ انفرادی اور اجتماعی دونوں شعبوں میں جب تک انسان کے پیش نظر یہ بات نہیں رہے گی اس کو زندگی میں کامیابی اور کامرانی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔'' (۵)

میرؔ نے جہاں انسان دوست شاعر کی حیثیت سے محبت و مروت کا پرچار کیا وہیں انھوں نے مختلف العقائد لوگوں کو رواداری اور وسیع المشربی کا درس بھی دیا۔ اس کی بنیادی وجہ میرؔ کا خارجی ماحول تھا۔ گویا چچا سید امان اللہ کی محبت اور درویشوں اور پیروں کے رمنوں، تکیوں اور خانقاہوں نے انھیں انسان دوستی کا سبق سکھایا۔ جس میں دیر و حرم کی حد بندیوں سے بلندی، کفر و ایمان دونوں کے ساتھ رواداری، رسم پرستی اور تنگ نظری کے خلاف بغاوت نمایاں ہے۔ میرؔ کے حلقۂ احباب میں تمام مذہب اور فرقوں کے لوگوں کے باعث مذہبی اثرات ان کے مزاج کا حصہ بن گئے اور وہ ہمیں تصوف کے وحدت الوجودی نظریے کے

قریب دکھائی دیتے ہیں۔ مشہور یونانی مؤرخ پوتارک نے درست کہا ہے:

''زمین پر چلتے پھرتے تم ایسے شہر بھی دیکھو گے جن کی دیواریں نہیں ہیں۔ ایسے بھی جن میں سائنس کی کوئی علامت دکھائی نہیں دیتی، ایسے بھی جہاں حکمران کوئی نہیں، ایسے بھی جہاں نہ محلات ہیں، نہ خزانے، نہ ورزش گاہیں، نہ تھیٹر۔ لیکن تم کوئی ایسا شہر نہیں پاؤ گے۔ جہاں دیوتاؤں کے مندر نہ ہوں۔ جہاں دعائیں نہ مانگی جاتی ہوں، جہاں منتیں نہ مانی جاتی ہوں جہاں پیشگوئیاں نہ کی جاتی ہوں۔ ایسا شہر نہ آج تک کسی انسان نے دیکھا ہے نہ کبھی دیکھنے میں آئے گا۔''(۶)

میرؔ جب کائنات کے ذرے ذرے پر غور کرتے ہیں تو انھیں یقین ہو جاتا ہے کہ اس کائنات کی کوئی شے عبث نہیں۔ یہی تجزیہ الہ کے تصور کو جنم دیتا ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خالق و مالک کائنات، لم یزل، رب ذوالجلال اور لائق احترام وسجدہ ہے۔ وہ نا صرف خود خدا کے عشق میں سرمست ہوتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی غوطہ زن ہونے کی تلقین کرتا ہے۔ کیوں کہ یہی عشق ابدیت کا حامل ہے۔ میرؔ کی مثنوی ''معاملات عشق''، عشق کی حقیقت یوں بیان کرتی ہے:

کچھ حقیقت نہ پوچھو کیا ہے عشق
حق اگر سمجھو تو خدا ہے عشق
عشق ہی عشق ہے نہیں ہے کچھ
عشق بن تم کہو کہیں ہے کچھ
عشق حاضر ہے عشق غائب ہے
عشق ہی مظہر عجائب ہے(۷)

میرؔ خود بھی ایک محبت بھرا اور احساس دل لے کر پیدا ہوئے تھے۔ دوسرے جس وقت انھوں نے اس جہاں میں آنکھیں کھولیں، ان کے چاروں طرف ایک ایسی فضا چھائی ہوئی تھی جس کے ذرے ذرے میں تصور عشق سمایا ہوا تھا۔ خود میرؔ کے والد علی متقی نے ان کو آغوش میں لے کر عشق کے متعلق یہ تعلیمات دیں:

''بیٹا عشق اختیار کرو۔ عشق ہی اس کارخانے پر مسلط ہے۔ اگر عشق نہ ہوتا تو یہ سارا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ بے عشق زندگی وبال ہے اور عشق میں دل کھونا، اصل کمال ہے۔ عشق ہی بناتا ہے اور عشق ہی بگاڑتا ہے۔ عالم میں جو کچھ ہے عشق کا ظہور ہے۔ آگ سوزش ہے، پانی رفتار عشق ہے، ہوا اضطرار عشق ہے، موت عشق کی ہستی ہے، حیات عشق کی ہوشیاری ہے، رات عشق کا خواب ہے، دن عشق کی بیداری ہے، تقویٰ قرب عشق ہے، گناہ بُعد عشق ہے، بہشت عشق کا شوق ہے، دوزخ عشق کا ذوق ہے اور مقام عشق تو عبودیت، عارفیت، زاہدیت، صدیقیت، خلوصیت اور حبیبیت سے بلند و برتر ہے۔''(۸)

میرؔ نے اپنی مثنوی ''دریائے عشق'' میں جذبۂ عشق کو تازہ کار و تازہ خیال کہا ہے۔ ان کے نزدیک عشق وجہ سکون بھی ہے اور سبب جنون بھی جب کہ دوسری طرف مثنوی ''شعلۂ عشق'' میں محبت کا وہ جذبہ بتایا ہے جس نے ظلمت کے پردے کو چاک

کیا اور نور کا ظہور ہوا گویا محبت نہ ہوتی تو جلوہ خداوندی کا ظہور نہ ہوتا اور نہ انسان کا وجود جنم لیتا:

محبت نے ظلمت سے گاڑھا ہے نور
نہ ہوتی محبت ، نہ ہوتا ظہور
محبت بن اس جا نہ آیا کوئی
محبت سے خالی نہ پایا کوئی
محبت ہی اس کارخانے میں ہے
محبت سے سب کچھ زمانے میں ہے(۹)

اس پس منظر میں جب میؔر کا عشق خان آرزو کے گھر کے حوالے سے اور میؔر کی مثنویات کے مطالعے سے ہمارے سامنے آتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ میؔر کا تصور حسن تجرید سے تجسیم تک کا سفر کرتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ جب میؔر اس پس منظر کو لے کر عملی زندگی میں قدم رکھتا ہے تو ایک سچے اور صادق عاشق کی طرح انھیں ہر سو اللہ تعالیٰ کا جلوہ ہی کارفرما دکھائی دیتا ہے:

نظر کر کے ٹک دیکھو ہر جا ہے وہ
نہاں و عیاں سب میں پیدا ہے وہ
بہر صورت آئینہ رہے گا جہاں
یہ سب عکس اس کے ہی پڑتے ہیں یاں
ملک ، جن و حیواں ، جماد و نبات
جو اس بن ہیں تو حیف ہے کائنات(۱۰)

انسان دوست میؔر کو کائنات میں حسن مطلق کی جھلک سب سے زیادہ اشرف المخلوقات یعنی انسان میں دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ میؔر کی شاعری کا مرکز و محور انسان ہے۔ وہ انسان کو نہایت قابل احترام اور جملہ مخلوقات میں شاہ کار اور مشیت کے لئے باعث فخر و ناز پیکر سمجھتا ہے۔ گویا انسان کو یہ عزت و توقیر دینے والی ذات رب تعالیٰ ہی کی ہے۔ میؔر کے ہاں انسانی فضیلت اور برتری کا اصل سرچشمہ تصوف کے افکار ہی سے پھوٹتا ہے۔ انھوں نے انسان کو مخلوق اور خدا کو ایک برتر ہستی قرار دیا ہے اور خدا کے اس احساس کو تسلیم کیا ہے کہ اس نے ہمیں پیدا کیا اور ساری مخلوقات پر فضیلت اور برتری کا شرف عطا کیا۔ ان کی رباعیات کے اشعار اس حقیقت کے غماز ہیں۔

کیسا احسان ہے خلق عالم کرنا
پھر عالم ہستی میں مکرم کرنا
تھا کار کرم ہی اے کریم مطلق
نا چیز کف خاک کو آدم کرنا(۱۱)

ڈاکٹر سید عبداللہ! میؔر کے ہاں انسانی عظمت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''میؔر کا ایک اہم موضوع انسان ہے۔ انسان کے متعلق ان کے تصورات میں ایک اثباتی سی جھلک پائی جاتی ہے۔ اس اثباتیت میں کچھ جذبہ، کچھ عقلی تجزیہ، کچھ تخیل کارفرما ہے۔ ان

کے اس تصور کا اصل سرچشمہ تو تصوف کے افکار سے پھوٹتا ہے کیوں کہ صوفیوں نے انسان کی فضیلت اور فوقیت پر بڑا زور دیا ہے۔ چنانچہ اس تفکر کا سلسلہ انا الحق اور سبحانی ما اعظم شانی سے جا ملتا ہے۔'' (۱۲)

میرؔ کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ انھوں نے ساری عمر دلی اور دل کے مرثیے لکھے۔ دراصل ان کا دل اور دلی سے تعلق اور اس کے زوال اور بربادی کا ملال ان کی انسان دوستی کا مظہر ہے۔ وہاں تہذیب کے بگڑنے کا غم ساری زندگی ان کے دم کے ساتھ رہا۔ وہاں کی کلیاں اور کوچے جو مصور اوراق کی طرح بیش قیمت اور قابل دید تھے بکھر کر رہ گئے اور ان گلیوں اور کوچوں میں رہنے والے لوگ ان کا مخصوص مزاج جسے نظام اقدار سے تعبیر کیجئے وہ بھی منتشر ہو کر رہ گیا۔ تہذیب ایک زندہ لاش بن کر رہ گئی۔ ظلم و بربریت نے نا صرف خارجی زندگی کو لہولہان کر کے رکھ دیا بلکہ داخلی زندگی بھی ریزہ ریزہ ہو کر رہ گئی۔ زوال و انحطاط کے اس دور میں شعرا جو فطرتاً حساس ہوتے ہیں۔ ماحول اور حالات سے نسبتاً زیادہ متاثر ہوئے۔ ایسی صورتِ حال میں میرؔ جیسا انسان دوست شاعر بھی حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اپنے جذبات اور رنج والم کو شاعری کی شکل میں پیش کیا اور ایسی رباعیات منظر عام پر آئیں جن کے لفظ لفظ سے ان کی انسان دوستی ٹپکتی ہے۔ میرؔ کو اقتصادی بدحالی کا بڑا شعور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ زوال آمادہ سلطنت کے انتشار و انحطاط کمزوری و ناتوانی معاشی و اقتصادی بدحالی، مفلسی اور درباری ماحول کا عبرت انگیز مرقع اپنے شہر آشوب، مثنویات، نظموں اور رباعیات میں انسانی ہمدردی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

دلی میں بہت سخت کی اب کے گزران — دل کو کر سنگ
غیرت نہ رہی عاقبت کار نہ شان — کھینچا یہ ننگ
یاروں میں نہ تھا کوئی مروت جو کرے — اجڑے تھے گھر
تا حدِ نظر صاف پڑے تھے میدان — عرصہ تھا تنگ (۱۳)

دراصل میرؔ جیسے انسان دوست شاعر کی شاعری کے موضوعات نہایت عام ہیں۔ ان کے مضامین میں غم والم، خلوص اور صداقت کی کارفرمائی موجود ہے۔ دوسروں کے لئے جو باتیں خیالی ہیں میرؔ کے لئے وہ حالی ہیں۔ وہ جس طرح کسی بات کو محسوس کرتے ہیں ایک ہمدرد انسان کی طرح من وعن الفاظ کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں۔ میرؔ جیسا انسان دوست شاعر چوں کہ معاشرے میں امن کا خواہاں ہے۔ اس لئے معاشرے میں موجود ہر برائی کو جڑ سے ختم کرنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرؔ نے اپنے زمانے کے بُرے کرداروں اور عام شہریوں کی ملمع سازی اور اخلاق ذمیمہ کے ساتھ ساتھ اپنے دور کے سماجی ماحول کا اپنی مثنویات میں بڑی باریک بینی سے مشاہدہ کر کے کھوکھلی زندگی سے بے باکانہ پردہ اٹھایا ہے۔ یہ سچ ہے کہ حضرت یوسفؑ کو دوسروں کے جھوٹ کی وجہ سے زنداں میں رہنا پڑا۔ کوہکن بھی اسی جھوٹ سے دلالہ کے فریب میں آ کر تیشہ مار کر مر گیا۔ اسی معاشرتی جھوٹ نے میرؔ کو بھی پریشان کیا جس کی نفی وہ اپنی نظموں میں کرتے ہیں۔ میرؔ جیسا درد دل رکھنے والا انسان معاشرے کی شکست وریخت پر نوحہ کناں ہوتا ہے۔ وہ مفلسی کی چادر اوڑھے بے بسی اور لاچاری کی تصویر بنے ان مفلسوں کا حال زار بیان کرتا ہے کہ کس طرح مفلسی قوائے انسانی کو مضمحل کر دیتی ہے۔

عمدے جو ہیں دنوں کو بھرتے ہیں
سو بھی اسباب گروی دھرتے ہیں

ہیں سپاہی سو بھوکے مرتے ہیں
لوہو پی پی کے زیست کرتے ہیں
ایک تلوار بیچے ہے اک ڈھال(۱۴)

بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:

''اردو شاعری میں میرؔ کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں جس طرح درد دل سنایا ہے انسانی زندگی کے جذباتی اور ذہنی، معاشرتی اور تہذیبی معاملات کی جس طرح ترجمانی کی ہے زندگی کے حسن اور کائنات کی خوبصورتی سے جس انداز سے اپنی دلچسپی اور والہانہ شیفتگی اظہار کیا ہے انسان کی عظمت کی جس طرح نشاندہی کی ہے لیکن ساتھ ہی اس کے المیہ پہلوؤں کو جس طرح پیش کیا ہے غم اور عرفان غم کی جو باتیں کی ہیں اور تخلیق جمال کے جو اہم کارنامے انجام دیئے ہیں ان کو سامنے رکھا جائے تو وہ بڑے ہی قد آور شخصیت کے شاعر نظر آتے ہیں۔''(۱۵)

دراصل میرؔ اپنے دور کے ٹوٹتے بکھرتے انسانی اور ڈگمگاتی اخلاقی اقدار پر گریہ کناں ہیں۔ وہ ایک انسان دوست اور حقیقت پسند انسان تھے وہ مغرب کے قنوطیوں کی طرح انسان کو اندھی مشیت کا کھلونا سمجھنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ دنیا کی بے ثباتی اور انسان کی مجبوریوں کا ذکر اس لئے کرتے ہیں تا کہ اس کی نگاہ ظاہر کی رنگینیوں میں کھو کر نہ رہ جائے بلکہ حقائق کی گہرائیوں میں اتر کر دیکھنے کی کوشش کرے۔ وہ اپنی مثنوبات میں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ پیش کر کے اس کی اصل حقیقت دنیا پر آشکار کرنا چاہتے ہیں۔ ایک صوفی انسانی زندگی کی ناپائیداری کے باوجود زندگی کو اہمیت دیتا ہے۔ اس کے نزدیک اس زندگی میں ایک مخصوص نظام اخلاق کا ہونا ضروری ہے۔ اس اخلاق کی بنیاد محبت، اخوت، مساوات، بھائی چارے اور شرافت پر ہوتی ہے۔ اس لئے وہ انسانیت اور انسانی اقدار کو عزیز رکھتا ہے اور اپنی اقدار کی ترویج اس کے پیش نظر ہوتی ہے۔ میرؔ کی نظموں میں ابھی اسی صورتِ حال کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی مثنوی ''در مذمت دنیا'' میں کائنات کے کاغذی پیرھن کا نقشہ یوں بیان کیا ہے:

سنو اے عزیزان ذی ہوش و عقل
کہ اس کارواں گہ سے کرنا ہے نقل
پیمبر ہے، شہ ہے کہ درویش ہے
سبھوں کو یہی راہ درپیش ہے
جسے دیکھو چلنے کا گرم تلاش
یہ منزل نہیں جائے بود اور باش(۱۶)

میرؔ کی تمام تر شاعری میں ہمیں انسان دوستی، مذہبی رواداری اور بے تعصبی کی گونج سنائی دیتی ہے۔ شاید یہ سب کچھ میرؔ کے عہد اور اس کے گھریلو ماحول کی دین ہے۔ دراصل میرؔ تمام مذاہب اور اس کے پیروکاروں میں یک جہتی دیکھنے کے متمنی ہیں۔ کیوں کہ یک جہتی پر امن معاشرے کی ضامن ہے۔ ان تمام کاوشوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس عہد میں تمام مذاہب کے لوگ ایک لڑی میں پروئے ہوئے ایک قوم کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ انسان دوست میرؔ نے اپنی مثنوی ''در بیان ہولی'' میں اس کا نقشہ اتارا ہے:

ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر
رنگ محبت سے عجب ہیں خرد و پیر
شیشہ شیشہ رنگ صرف دوستاں
صحن دولت خانہ رشک بوستاں
دستہ دستہ رنگ میں بھیگے جواں
جیسے گل دستہ تھے جووں پر رواں(۱۷)

یوں دیکھا جائے تو خدائے سخن میرؔ کی نظمیں مثنویات، مراثی، شہر آشوب اور رباعیات عہد بہ عہد انسانی حقوق، تکریم آدمیت، پیار و محبت، صبر و تحمل، ایثار و قربانی، وفا شعاری، وسیع المشربی اور عظمت بشر کے نغمے الاپتیں اور سب سے بڑھ کر انسان دوستی کی ایسی داستان سناتی ہیں جو وقت کے کسی ایک منطقے تک محدود نہیں بلکہ بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ جن نت نئے طریقوں سے انسانی آزادی، مساوات اور انسان دوستی کے خواب کو پامال کیا گیا ہے ان سب کی احتجاج آمیز آگاہی کا فریضہ بہ احسن خوبی نبھا رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج سینکڑوں سال بعد بھی میرؔ کا نام زندہ ہے بلکہ جب تک اردو ادب زندہ و جاوید ہے اس کے صفحۂ قرطاس پر سب سے نمایاں رنگ بن کر ابھرا رہے گا۔ بقول ڈاکٹر تحسین فراقی:

> ''میرؔ کی شاعری اپنی تمام گریہ وزاری کے باوجود حوصلہ شکن شاعری، بے حوصلگی کی شاعری، دنیا سے بے زاری کی شاعری، بیمار تصورات کی شاعری ہرگز نہیں ہے۔ یہ شاعری پامردی کی شاعری ہے۔ میرؔ کی آواز میں ایک للکار چھپی ہوئی ہے۔ یہ ایک مردانہ وار آواز ہے۔ یہ آواز ایک ایسے دلیر اور سورما کی آواز ہے جو ایک لٹتے اور مٹتے ہوئے ہندوستان اور موت سے دو چار ہوتی ہوئی ایک زندگی کی آواز ہے۔ میرؔ کی شاعری ہمیں موت نہیں دیتی زندگی دیتی ہے۔ یہ شخص سر سے پیر تک گھائل ہو کر بھی زندگی کی آبرو پر آنچ نہیں آنے دیتا۔''(۱۸)

حوالہ جات

1. Robert p Gwinn. Encyclopedia Britannica. Vol 20, Chicago. U.S.A. 1962. p665

۲۔ عبدالحق، مولوی، مقدمہ انتخاب کلام میر، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۲ء، ص:۱۶
۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، محمد تقی میر، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۰ء، ص:۳۵
۴۔ میر تقی میر، کلیات میر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص:۷۰۲
۵۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، میر تقی میر، لاہور: ادارہ ادب و تنقید، ۱۹۸۰ء، ص:۱۴۷
۶۔ ایس۔ ایم۔ شاہد، تقابل ادیان، لاہور: ایور نیو بک پلس، س ن، ص:۷
۷۔ میر تقی میر، کلیات میر، ص:۹۱۸
۸۔ عبدالحق، مولوی، ذکر میر، دہلی: انجمن اردو پریس اورنگ آباد، ۱۹۲۸ء، ص:۸
۹۔ میر تقی میر، کلیات میر، ص:۸۹۰
۱۰۔ ایضاً، ص:۹۳۷

۱۱۔ ایضاً،ص:۶۹۷

۱۲۔ عبداللہ،سید،ڈاکٹر،ولی سے اقبال تک،لاہور:اکیڈمی منصور پریس،باردوم،مئی۱۹۶۳ء،ص:۱۰۰

۱۳۔ میر تقی میر،کلیات میر،ص:۷۰۸

۱۴۔ کلب علی خاں فائق،کلیات میر،جلد پنجم،لاہور:مجلس ترقی ادب،۱۹۸۲ء،ص:۱۱۶

۱۵۔ عبادت بریلوی،ڈاکٹر،میر تقی میر،لاہور:ادارہ ادب وتنقید،ص:۱۱۵

۱۶۔ میر تقی میر،کلیات میر،ص:۹۷۴

۱۷۔ ایضاً،ص:۷۸۹

۱۸۔ تحسین فراقی،ڈاکٹر،عزیز ابن الحسن،ڈاکٹر،میر تقی میر،میر شناس منتخب مضامین،مقتدرہ قومی زبان پاکستان،طبع اول،۲۰۱۰ء،ص:۱۷۶

☆.....☆.....☆